خیابان بہار ۲۰۲۴ء

# اُردو ادب میں ترقی پسند تحریک آغاز و تعارف

پروفیسر فوزیہ سحر ملک

**ABSTRACT**

Progressive Movement is richest Movement of Urdu Literature. It has great effect on Urdu Prose and Poetry since its beginning. This article narrates early history of this Movement and throw lights on different historical steps of this Movement with reference of its pioneers and followers. This article is research__oriented and clearly describe the aims and objects of this movement with reference of its manifesto and early sources.

ترقی پسند تحریک سے وابستہ ادیبوں کی طرف سے (1931ء میں) شائع ہونے والی پہلی کتاب اُردو افسانوں کا مجموعہ "انگارے"، تھا، یہ افسانے اپنے مزاج اور مضامین کے اعتبار سے سماجی، معاشرتی اور مذہبی روّیوں اور اخلاقی روّیوں پر ایک بے باکانہ ردِّ عمل کا اظہار ہے۔ "انگارے"، کے افسانہ نگاروں میں احمد علی، سجاد ظہیر، رشید جہاں اور محمود الظفر شامل تھے۔ بقول سیّد احتشام حسین:

> "یہ نوجوان مصنف زندگی کی بے یقینی اور یک رنگی سے گھبرائے اور جذباتی انقلابی تصورات سے بھرے ہوئے تھے"۔(۱)

"انگارے"، میں شامل انسانوں کی انفرادیت اُن کے مضامین و افکار کے سبب ہے، جہاں تک افسانے کی صنف کے اعتبار سے اُن کے اعتبار اور قدر و قیمت کا تعلق ہے، اُن کا ادبی پایہ زیادہ بلند نہیں، ان افسانوں کی جمع آوری اور پیش کش میں یہ مقصد پیشِ نظر بھی نہیں تھا۔ بقول عزیز احمد:

"انگارے"، کی اشاعت سماج پر پہلا وحشیانہ حملہ تھا۔ (اُن کے خیال میں): اس کی اشاعت سے نئے ادب نے خود مختاری کا علم بلند کیا.....۔

وہ آگے چل کر "انگارے"، کے مصنفین میں احمد علی کا بطورِ خاص ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

> "اُنہوں نے دہلی کی قدیم رجعت پسند زندگی اور اس کے مشغلوں خصوصاً کبوتر بازی کی بہت اچھی تصویریں کھینچی ہیں .....(یہ افسانے)، ترقی پسند تحریک اور ترقی

پسند افسانے کی تعمیر کے ابتدائی دور کے ہیں، اس لیے اگر ترتیب و ترکیب یا تکنیک
میں کچھ خامیاں ہیں یا اگر اس میں دقّت اتنی زیادہ ہے کہ اس سے افسانے کے فنی
توازن پر اثر پڑتا ہے تو یہ سب کمزوریاں قابلِ معافی ہیں"۔(۲)

سجاد ظہیر نے بھی "انگارے"، میں شامل افسانوں کے فن کی نسبت اُن کے موضوعات کا ذکر کیا ہے۔ ان کے بقول:

"انگارے"، کی بیشتر کہانیوں میں سنجیدگی اور ٹھہراؤ کم اور سماجی رجعت پرستی اور
دقیانوسیت کے خلاف غصہ اور ہیجان زیادہ تھا"۔(۳)

"انگارے"، کی اشاعت پر ہندوستان کے مختلف ادبی، سیاسی اور مذہبی شخصیات اور حلقوں کی طرف سے اس کے خلاف احتجاج کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا، مختلف اخبارات و رسائل میں "انگارے"، کے خلاف اداریے اور مضامین لکھے گئے، نیاز فتح پوری اور عبد الماجد دریا آبادی جیسے ثقہ مصنفین نے اس کتاب کی مخالفت میں مضامین لکھے، اخبار 'مدینہ'، اور 'سرفراز'، کے مخالفانہ اداریوں کے سبب "انگارے"، کے خلاف ایک فضا بن گئی اور مارچ ۱۹۳۳ء میں اس کتاب کو حکومت کی طرف سے ضبط کر لیا گیا اور اس کی اشاعت و فروخت ممنوع قرار دے دی گئی۔

ترقی پسند تحریک کے مقاصد کے اعتبار سے بلاشبہ "انگارے"، کو پہلی اہم کتاب کا درجہ حاصل ہے، اس کی اشاعت سے ادبی حلقوں میں ایک ہلچل اور ردِ عمل پیدا ہُوا لیکن جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چُکا ہے، فنی اعتبار اور ادبی معیار کے حوالے سے "انگارے"، کے افسانے اُردو فسانے کے ارتقاء میں کوئی قابلِ ذکر اضافہ نہیں، اگر اس کی ضبطی کا واقعہ پیش نہ آتا تو یہ کتاب شاید اتنی زیرِ بحث بھی نہ رہتی اور یہ افسانے وقت کی گرد میں غائب ہو جاتے۔ ایک منتخب افسانوی مجموعہ کے بطور اس میں زندہ رہنے کی وہ صلاحیت نہیں تھی جو مہارت اور تجربہ کارانہ تخلیقی صلاحیتوں کا نتیجہ ہوتی ہے، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس کی اشاعت ترقی پسند ادب میں ایک ہنگامہ اور ایک رجحان ساز ادبی واقعہ ثابت ہوئی اور کسی نہ کسی حوالے سے اس کا ذکر اُردو افسانے کی تاریخ کے بیان میں آج تک ہو رہا ہے۔

"انگارے"، کے مصنفین کی طرف سے اس کتاب کی ضبطی کے بعد ایک مشترکہ بیان اخبار "لیڈر"، میں شائع ہُوا، جس میں نہ صرف یہ کہ انہوں نے "انگارے"، کی اشاعت کے حوالے سے اپنے ارادے اور رضامندی کا اظہار کیا بلکہ مستقبل میں بھی ایسے "افسانے"، انتخابات اور ادب پارے تحریر و ترجمہ اور شائع کرنے کی ضرورت اور ارادے کا اظہار کیا۔ اس بیان میں کہا گیا تھا:

"..... تقریباً پانچ ماہ قبل چار نوجوان مصنفین نے جن میں ایک نوجوان خاتون بھی شامل ہیں..... افسانوں کا ایک مجموعہ "انگارے"، کے نام سے شائع کیا ہے، اِس کتاب کے مصنف اِس کی اشاعت پر کسی طرح نادم نہیں..... وہ اتنا چاہتے ہیں کہ نہ صرف یہ کتاب بلکہ ایسی اور کتابیں شائع کرنے کا، تحفظ باقی رہے..... ہماری عملی تجویز یہ ہے کہ ایک لیگ آف پراگریسو آتھرس ( League of Progressive Authors)، قائم کی جائے جو اس قسم کے مجموعے وقتاً فوقتاً انگریزی اور ملک کی دوسری مقامی زبانوں میں شائع کرے....."۔(۴)

ڈاکٹر انور سدید نے ترقی پسند تحریک کے ذیل میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے "لیڈر"، میں چھپنے والے اس بیان کا باریک بینی سے جائزہ لیا ہے۔ اُن کے بقول:

"اس بیان کی اہمیت یہ ہے کہ اولاً اس میں اپنے عہد کے مروجّہ نظام کے خلاف آواز اُٹھانے کی جرأت موجود ہے، ثانیاً اس میں ادبا کو متحرک کرنے اور ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کا جذبہ نظر آتا ہے، ثالثاً اس بیان میں ایک اہم لفظ پراگریسو(Progressive)، استعمال ہُوا ہے، جس کا ترجمہ اُردو میں ترقی پسند کیا گیا ہے اور بعد میں اِسی نام سے ایک اہم تحریک موسوم ہوئی"۔(۵)

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ "انگارے"، کی اشاعت کے بعد "انگارے"، کے مصنفین کی طرف سے شائع ہونے اس مشترکہ بیان کی اہمیت ایک "اعلان نامہ"، کی تھی، اس بیان میں اغراض و مقاصد اور اہداف کی وہ فکری اساس موجود تھی جس پر ایک تحریک کو استوار کیا جا سکتا تھا۔

"انگارے"، کے بعد پروفیسر احمد علی کی طرف سے افسانوں کی ایک کتاب "شعلے"، شائع ہوئی، "شعلے"، میں چھپنے والے افسانوں کے موضوعات اور کہانیوں کے مرکزی خیالات کا رنگ ڈھنگ بھی "انگارے"، جیسا تھا، اگرچہ "شعلے"، کی شہرت "انگارے"، جیسی تو نہ ہوئی لیکن اس نے انگارے کے سماج اور مذہب بیزار رجحانات کو ایک واضح میلان دینے میں اہم کردار ادا کیا، یوں بہت سے افسانہ نگاروں، شاعروں اور لکھنے والوں کو معاشرے میں موجود سماجی و مذہبی رویوں اور قدروں کے بارے میں نہ صرف بات کرنے کا بے باکانہ انداز ملا بلکہ اُن کی تحریروں اور سوچ میں ایک نمایاں تبدیلی کے آثار بھی ظاہر ہونا شروع ہوئے۔

ترقی پسند تحریک کے خدّوخال بنانے اور سنوارنے میں ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے مقالہ "ادب اور زندگی" کی اہمیت بھی نمایاں ہے۔ یہ مقالہ پہلے ہندی زبان میں اکتوبر ۱۹۳۴ء میں اور پھر اُردو زبان میں جولائی ۱۹۳۵ء میں شائع ہُوا۔ اس مقالے میں جیسا کہ اس کے عنوان سے ظاہر ہے، ادب کو زندگی کے ساتھ منسلک کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ اِس زمانے میں اُردو میں رومانویت کی تحریک زوروں پر تھی اور ادب کا رشتہ زندگی سے کٹ کر رومان و تخیل کی فضاؤں سے جُڑا ہُوا تھا۔ افسانہ نگاروں اور شاعروں کی اکثریت ادب کو ایک ذہنی مشغلہ گردانتی تھی، یوں ادب و شعر حقیقت سے دُور ہو گئے تھے۔ اہلِ قلم متخیلہ سے کوئی زندگی آموز کام لینے کی بجائے تصورات میں رنگین پناہ گاہیں تلاش کرتے اور ایسا انشائے لطیف تخلیق کرتے جو زندگی کے تقاضوں سے کٹا ہُوا ہوتا۔ سجاد حیدر یلدرم، مہدی افادی، اختر شیرانی، نیاز فتحپوری، حفیظ جالندھری، سجّاد انصاری وغیرہ کی تخلیقات میں رومانیت کے عناصر نمایاں تھے۔ اِس دور کی تحریکوں میں جمالیات اور حُسن کا اُلوہی زاویہ دریافت کرنے اور ارضی حُسن سے رومانی لذّت و انبساط اور مسرت و حظ اُٹھانے کا رجحان واضح طور پر نظر آتا ہے۔

ان دنوں یلدرم کی "خیالستان"، اور نیاز فتحپوری کی "رومانیت"، نے نوجوان طبقے کو بہت متاثر کیا ہوا تھا۔ "شہاب کی سرگزشت"، اور "شاعر کا انجام"، نیاز کے دو ایسے افسانے تھے جو بیشتر نوجوان ہر وقت وردِ زبان رکھتے تھے۔ بقول محمد حسن عسکری:

> "نیاز کی عطا یہ ہے کہ اس نے جذبات پرستی کو ایک مذہب بنا دیا"۔(۶)

ادب کی اس رومانوی فضا میں ڈاکٹر اختر حسین کے مذکورہ بالا مضمون نے لکھنے والوں کی توجہ جن امور کی طرف دلائی ان کا خلاصہ یہ ہے:

> "اوّل:__ صحیح ادب کا معیار یہ ہے کہ وہ انسانیت کے مقصد کی ترجمانی اس طریقے سے کر سکے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس سے اثر قبول کر سکیں، اِس کے لیے دِل میں خدمتِ خلق کا جذبہ پہلے ہونا چاہیے"۔
>
> "دوم:__ ہر ایماندار اور صادق ادیب کا مشرب یہ ہے کہ قوم و ملّت اور رسم و آئین کی پابندیوں کو ہٹا کر زندگی، یگانگی اور انسانیت کی وحدت کا پیغام سنائے"۔
>
> سوم__ ادیب کو رنگ و نسل اور قومیت اور وطنیت کے جذبات کی مخالفت اور اخوّت اور مساوات کی حمایت کرنی چاہیے اور اِن تمام عناصر کے خلاف جہاد کا پرچم

بُلند کرنا چاہیے، جو دریائے زندگی کو چھوٹے چھوٹے چوبچوں میں بند کرنا چاہتے ہیں"۔(۷)

ڈاکٹر اختر حسین کے اس مضمون نے بقول ڈاکٹر انور سدید:

"نوجوان ادبا.....کا ناطہ زندگی سے جوڑ دیا اور یوں وہ اساس دستیاب ہو گئی جس پر بعد میں ترقی پسند تحریک نے اپنا سفر جاری کیا"۔(۸)

زندگی کے نئے تقاضوں سے ادب کو ہم آہنگ کرنے کے لیے اور ادب کو زندگی کا ترجمان بنانے کے لیے اگرچہ اُردو زبان و ادب میں پہلے بھی آواز بُلند ہوتی رہی، سر سید احمد خاں کے زیرِ اثر علی گڑھ تحریک بھی اپنے واضح مقاصد رکھتی تھی۔ الطاف حسین حالی نے بھی شاعری کو زندگی کے جدید تقاضوں کا ہم نَوا بنانے کے لیے بڑی بھرپور کوشش کی۔ اکبر الہ آبادی نے اپنے مخصوص لب و لہجہ سے بھی اصلاح احوال کا کام لیا، علامہ اقبال نے بیسویں صدی کے پہلے ربع میں شعر و ادب کے فریضے کو اتنی اہمیت دی کہ اس سے "آدم گری"، کے مقصد کو منسلک کر دیا۔ وہ کہتے ہیں:

؎ شعر را مقصود اگر آدم گری است
شاعری جزویست از پیغمبری است(۹)

یوں سچے فنکار کا منصب بھی پیغمبروں کے اعلیٰ مقاصد کے زمرے میں آجاتا ہے لیکن "ترقی پسند تحریک"، کی ابتدا ایک باقاعدہ، منصب اور مبسوط طریقہ کار سے ہوئی۔

یہ اُردو ادب کی پہلی تحریک تھی جِسے ایک باضابطہ منشور کے اعلان کے ساتھ اور ہم خیال اہلِ قلم کی مشاورت سے شروع کیا گیا، جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا، "انگارے"، کی اشاعت، پروفیسر احمد علی کے خیالات اور ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے مضمون، "ادب اور انقلاب"، کی اشاعت سے ہندوستان کے ادبی حلقوں میں اُن مقاصد اور خیالات کی ترویج و اشاعت کی فضا بن چکی تھی، جو ترقی پسند تحریک کے اہداف میں شامل تھے۔ ۱۹۱۷ء میں سوویٹ یونین میں اشتراکی انقلاب کے بعد اس کی کچھ لہریں ہندوستانی سیاست دانوں اور دانشوروں کے ذہنوں تک بھی پہنچ چکی تھیں۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے خیالات میں روسی اہلِ قلم ٹالسٹائی اور میکسم گورکی کے افکار کی چاپ بھی سُنائی دیتی ہے۔ اُن کے مضمون "ادب اور زندگی"، میں ادب کے بارے میں بعض سوالات اور نکات کو بنیادی اور محوری قرار دیا گیا۔

مثلاً، یہ ادیب کا حق ہے کہ وہ نئے ماحول کے مطابق ادب تخلیق کرے اور ابواب کی رجعت پسندانہ قدروں سے بغاوت کا اعلان کرے۔

وہ ادب کو زندگی سے منسلک کرے اور ایسے خیالات و افکار کو اپنے فن کا موضوع بنانے جو زندگی کو آگے بڑھانے والے ہوں۔

اختر حسین رائے پوری نے "ترقی پسند تحریک"، کے تاسیسی اجلاس (Feudatory Meeting)، سے کچھ عرصہ پہلے ادب کے بارے میں اپنے خیالات کو ایک باقاعدہ منشور کی شکل دینے کے لیے اپریل ۱۹۳۶ء میں ناگپور شہر میں منعقد ہونے والے "ساہتیہ پرشد"، کے ایک اجلاس میں ایک دستاویز پڑھی، جِسے ترقی پسند تحریک کے منشور کا اولین مسوّدہ بھی کہا جا سکتا ہے، اس کی تاریخی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ اس اجلاس میں ادب و شعر کی کئی نمایاں شخصیات نے حصہ لیا اور ان کے خیالات کی تائید کی، ان شخصیات میں منشی پریم چند، مولوی عبد الحق، (جنہیں بعد میں بابائے اُردو کا خطاب دیا گیا)، اچاریہ نریندر دیو اور پنڈت جواہر لعل نہرو شامل ہیں، اختر حسین رائے پوری کے اعلان نامے پر ان سب نے دستخط کیے۔ اس اعلان نامے کے اہم نکات یہ ہیں:

> "..... ہمارے خیال میں ادب کے مسائل کو زندگی کے دوسرے مسائل سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا، زندگی ایک مکمل اکائی ہے،..... اور ادب زندگی کا آئینہ اور کاروانِ حیات کا رہبر ہے..... ہم نے یہ تو طے کر لیا ہے کہ ادب کا قالب کیا ہو مگر یہ نہیں بتایا کہ اس کے قالب کا رنگ روپ کیا ہو؟ پہلے تو یہ دیکھنا ہے کہ کیا کہنا ہے؟ اور کن سے کہنا ہے؟..... کیسے کہنا ہے؟ کا سوال بعد میں پیدا ہوتا ہے..... چنانچہ ہندوستانی ادیبوں سے ہماری یہ توقع واجب اور جائز ہے، وہ یہ ثابت کر دکھائیں کہ ادب کی بنیادیں زندگی میں پیوست ہیں، زندہ اور صادق ادیب وہی ہے جو سماج کو بدلنا چاہتا ہے..... اور جملہ بنی نوع انسان کی خدمت کی آرزو رکھتا ہے، ہمیں یقین ہے کہ ہمارے ملک کا ادب جب زندگی سے اپنے آپ کو وابستہ کرے گا تو زندگی کے ارتقا کا علمبردار ہو گا"۔ (۱۰)

"ترقی پسند ادب"، مرتب کرتے ہوئے علی سردار جعفری نے اِسی قسم کے خیالات کو دہرایا ___ یہ کتاب اگرچہ تحریک کے آغاز کے تقریباً بیس سال بعد لکھی اور شائع ہوئی جب کہ یہ ترقی باضابطہ طور پر اپنے تنظیمی وجود کو

ختم کر چکی تھی لیکن علی سردار جعفری کے خیال میں نہ صرف ان دِنوں بھی بلکہ ہر سماج اور زمانے میں اس انداز کی تحریکیوں کی ضرورت رہی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "میرے لیے یہ سوال خاص طور پر اہم .....ہے کہ آج کل ترقی پسند مصنفین کی انجمن کے متعلق طرح طرح کی رائیں ظاہر کی جارہی ہیں، ایک حلقہ یہ محسوس کرتا ہے کہ اب ترقی پسند مصنفین کی انجمن کی ضرورت نہیں ہے، ممکن ہے یہ خیال صحیح ہو لیکن ترقی پسند تحریک کی ضرورت باقی ہے، ایک ایسے سماج میں جہاں نیکی اور بدی کی طاقتیں برسرِپیکار ہوں ایسی شعوری، ادبی تحریکوں کی ضرورت باقی رہتی ہے، جو ادب کی اثر آفرینی کے پیشِ نظر اس کو نیکی کے حق میں استعمال کرنے کی کوشش کرتی ہیں اس کے علاوہ حقیقت نگاری اور جمالیات کے مسائل ہر عہد میں نئی طرح سے حل کئے جانے کا مطالبہ کرتے ہیں، اس لئے ان سے متعلق سارے مباحث کو زندہ رہنا چاہیے۔ میری کتاب کی نئی زندگی کا جواز صرف اتنا ہے....."۔(۱۱)

ترقی پسند ادبی تحریک کے حوالے سے معروف ناقد خلیل الرحمن اعظمی لکھتے ہیں کہ یہ بیسویں صدی کے چوتھے دہے میں اُبھرنے والی ایک طاقتور اور باضابطہ تحریک ہے (اور یہ):

"اُردو ادب کی پہلی تحریک تھی، جس کے پاس اپنا ایک منشور اور ادب تخلیق کرنے کے لیے ایک واضح مقصد اور لائحۂ عمل تھا۔ یہ تحریک لندن میں زیرِ تعلیم، اشتراکی فلسفے سے دلچسپی رکھنے والے چند نوجوانوں کے مسامی کا نتیجہ تھی۔ وہیں ڈاکٹر ملک راج آنندہ، سجاد ظہیر، ڈاکٹر جیوتی گھوش، ڈاکٹر کے۔ ایس بھٹ، ڈاکٹر ایس سنہا اور ڈاکٹر محمد دین تاثیر وغیرہ نے ۱۹۳۵ء میں اِس کا پہلا منشور ترتیب دیا۔ اس منشور میں ادب اور فن کو قدامت پرستی اور توہم پرستی سے نجات دلا کر عوام سے قریب تر لانے کے لیے زندگی کی بنیادی حقیقتوں کی عکاسی پر خاص زور دیا گیا تھا، تاکہ عوام میں انقلابی روح بیدار ہو.....

خلیل الرّحمن اعظمی اِس تحریک کے حوالے سے آگے چل کر یہ بھی لکھتے ہیں کہ:

> "..... یہ ہندوستان کی پہلی ادبی تحریک تھی جس میں نہ صرف اُردو کے ادیب شامل تھے بلکہ دوسری زبانوں کے ادیب بھی نظریاتی اتحاد کی بنا پر ایک مشترک پلیٹ فارم پر جمع ہو رہے تھے"۔(۱۲)

ترقی پسند تحریک کا یہ منشور انسان دوستی، جمہوریت پسندی اور اخوت و مساوات کے جن انقلابی جذبوں پر مبنی تھا وہ اس وقت کے ہندوستانی ماحول خصوصاً جنگِ آزادی کے لیے اس قدر موزوں تھا کہ نہ صرف نوجوان ادیبوں نے اس کا خیر مقدم کیا بلکہ بہت جلد پریم چند، مولوی عبدالحق، مولانا حسرت موہانی، آچاریہ نریندر دیو، ٹیگور، جواہر لال نہرو اور جوش ملیح آبادی جیسے مقتدر ادیبوں، دانشوروں اور سیاست دانوں کی حمایت بھی اسے حاصل ہو گئی۔

ترقی پسند ادبی تحریک میں سجاد ظہیر کو روحِ رواں کی حیثیت حاصل ہے۔ ۱۹۳۵ء کے اواخر میں وطن واپس آنے پر اُنہوں نے الٰہ آباد میں چند ہم خیالوں کے تعاون سے انجمن کی تشکیل کی اور ان کی مساعی سے ہندوستان کے مختلف شہروں میں اس کی تنظیمیں قائم ہونے لگیں۔ اپریل ۱۹۳۶ء میں کل ہند مرکزی تنظیم قائم کرنے اور ادب و ادیب کے مسائل پر غور و خوض کرنے کی غرض سے لکھنؤ میں پریم چند کی صدارت میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس کا اعلان نامہ اور پریم چند کا خطبۂ صدارت تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ پریم چند نے ادب کی غرض و غایت پر روشنی ڈالتے ہوئے صحیح ادب کے معیار کی تعیّن اس طرح کی کہ:

> "ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اُترے گا جس میں تفکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، حُسن کا جوہر ہو، تعمیر کی روح ہو، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو جو ہم میں حرکت، ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے، سلائے نہیں، کیوں کہ اب زیادہ سونا موت کی علامت ہو گی"۔(۱۳)

سجاد ظہیر نے پریم چند کے خیالات پر اپنی رائے دیتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> "ترقی پسند ادبی تحریک کی غرض و غایت کے متعلق شاید اس سے بہتر (پریم چند کا خطبہ صدارت)، کوئی چیز ابھی تک نہیں لکھی گئی"۔(۱۴)

ترقی پسند ادبی تحریک جس بلند کوش نصب العین کے تحت وجود میں آئی تھی، اِسی باعث ہزار مخالفتوں کے باوجود ہندوستان گیر پیمانے پر بڑی سُرعت سے مقبول ہونے لگی۔ نئے ادیبوں اور شاعروں کی شمولیت سے اس تحریک میں نیا جوش و خروش پیدا ہوتا گیا۔ ترقی پسندوں کے نزدیک ادب کا بنیادی کام اجتماعی زندگی کی ترجمانی ہے اور اس میں دو خصوصیتیں لازمی طور پر ہونی چاہییں:

> "اوّل تو یہ کہ وہ اپنے دور کی اجتماعی زندگی سے ایک گہرا اور براہِ راست تعلق رکھتا ہو۔ دوسرے یہ کہ اس کی تخلیق ایک مخصوص اور واضح سماجی مقصد کے ماتحت عمل میں آئے"۔(۱۵)

اس سماجی مقصد کی بار آوری انھیں (ترقی پسندوں کو) سوشلسٹ نظام میں نظر آتی ہے۔ اس طرح تحریک کی فکری اساس اشتراکی فلسفے پر استوار ہے۔ ڈاکٹر خلیل الرحمن 'نیا ادب' (شمارہ اکتوبر ۱۴۰ء) کے اداریے کے حوالے سے ترقی پسند تحریک کے اغراض و مقاصد کے اس رُخ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "اس ملک میں شہنشاہیت کی کمزوری سے ساری دُنیا کی ترقی پسند قوتوں کو فائدہ پہنچے گا۔ ہندوستان اور چین سامراج دُشمن محاذ کے سب سے اہم مورچے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہماری جمہوری تحریک دُنیا کی انقلابی اشتراکی تحریک سے علیحدہ نہیں کی جا سکی۔ اس قسم کی علیحدگی کی کوشش کرنا اپنی طاقت کو گھٹانا ہو گا۔ ترقی پسند مصنفین کی جگہ اس اشتراکی اور جمہوری تحریک میں ہونی چاہیے۔ یہی وہ تحریکیں ہیں جن میں زندگی ہے، یہی وہ ذرائع ہیں جو دراصل انسانی سماج میں انقلاب پیدا کریں گے، یہی ترقی کے سچے راستے ہیں"۔(۱۶)

ترقی پسندی کی ایک اور نمایاں جہت سیاست ہے۔ ترقی پسندوں کے نزدیک نہ صرف ادباؤ شعرا کو واضح سیاسی شعور کا حامل ہونا چاہیے بلکہ شاعروں اور ادیبوں کو سیاسی جدوجہد میں بھی عملاً حصہ لینا چاہیے۔ ڈاکٹر عبدالعلیم کے لفظوں میں:

> "سماجی زندگی کی عکاسی کے لیے محض جذبہ کافی نہیں بلکہ مطالعہ اور تجربہ کی بھی ضرورت ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب ادیب سماجی کشمکش سے دُور نہ بھاگے بلکہ اس کو اپنی زندگی کا جزو بنالے، سماج کے دُکھ سُکھ کو اپنا دُکھ سُکھ سمجھے۔ جب تک جگ بیتی آپ بیتی نہ ہو جائے اس وقت تک ایسا ادیب پیدا نہیں ہو سکتا، جس میں خلوص ہو"۔(۱۷)

اس تحریک کی چوتھی بنیاد سائنسی عقلیت پسندی ہے۔ یعنی زندگی کے مختلف مسائل کے حوالے سے ترقی پسند مصنفین کا روّیہ مادّی اور تعقّل پسند ہونا چاہیے۔

علی سردار جعفری اِس بارے میں کہتے ہیں کہ:

> "ہندوستانی ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ ہندوستانی زندگی میں رُونما ہونے والی تبدیلیوں کا بھرپور اظہار کریں اور ادب میں سائنسی عقلیت پسندی کو فروغ دیتے ہوئے ترقی پسند تحریکوں کی حمایت کریں۔ اُن کا فرض ہے کہ وہ اس قسم کے اندازِ

تنقید کو رواج دیں جس سے خاندان، مذہب، جنس، جنگ اور سماج کے بارے میں
رجعت پسندی اور ماضی پرستی کے خیالات کی روک تھام کی جا سکے"۔(۱۸)

اس طرح ترقی پسند ادبی تحریک کا تصوّرِ ادب، اشتراکیت، اجماعتی سیاست، سائنسی عقلیت اور مادّیت پر استوار ہے۔ ترقی پسند ادبی تحریک کا آغاز وسیع تر مقاصد اور صالح نقطہ نظر کے ساتھ ہُوا جیسا کہ اس کے پہلے منشور نیز پریم چند، جواہر لال نہرو اور عبد الحق کے بیانات سے مترشح ہے۔ ان لوگوں نے اپنے متوازن خیالات سے نوجوان ادیبوں کی بے اعتدالیوں اور کجرویوں کو دُور کرنے کی کوشش کی۔ مگر رفتہ رفتہ اس تحریک میں دو طرح کے رویّے راہ پانے لگے۔ ایک کے تحت ادیب کو واضح سیاسی شعور رکھنے کے باوجود وقتی اور جماعتی سیاست سے بُلند ہونا چاہیے۔ کیوں کہ معروف ترقی پسند ناقد مجنوں گورکھپوری کے لفظوں میں:

"ادب جماعتی تو ہوتا ہے لیکن ادب اس وقت ہوتا ہے جب وہ جماعت کی
سرحد سے کچھ آگے اور اس کی سطح سے کچھ بُلند ہو"۔(۱۹)

اختر انصاری اپنے طور پر اس بات کی وضاحت یوں کرتے ہیں کہ:

"کامیاب مقصدی ادب وہی ہے جو فن اور مقصد کا بہترین امتزاج پیش کرے،
یعنی مقصدی ہونے کے باوجود اصولِ جمالیات کی پیروی کرتے ہوئے فن کے اعلیٰ
معیار پر پُورا اُترے"۔(۲۰)

یہ نظریہ ماضی کی توانا ادبی روایت کا احترام اور ادیب کی انفرادیت کا پاس رکھتا ہے، نیز مواد اور ہیئت کو ایک عضویاتی کل کے طور پر تسلیم کرتا ہے۔ ایسی ادبی فضا قائم کرنے والوں میں سجاد ظہیر، مجنوں گورکھپوری، اختر انصاری، آل احمد سرور اور ممتاز حسین وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

ترقی پسندوں کا دوسرا گروہ ادب کو سماجی جدوجہد کا آلۂ کار مانتا تھا اور سماجی جدوجہد کو اشتراکی سیاست کا نام دیتا تھا۔ اس کے نزدیک ادیب کے لیے بائیں بازو سے سیاسی وابستگی ضرور تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۴۹ء، کے بعد ترقی پسند ادبی تحریک میں اس انتہا پسند گروہ کو غلبہ حاصل ہونے لگا، خصوصاً ہندوستان کی آزادی کے بعد نظریاتی ادّعائیت کی لہر اور تیز تر ہو گئی۔ پانچویں کل ہند بھیمڑی کانفرنس کا نیا منشور (۱۹۴۹ء)، اس کی واضح مثال ہے:

"جس میں ترقی پسند ادیبوں کے لیے جماعتی سیاست کی وفاداری اور اشتراکی
جماعت کے پروگراموں میں عملی شرکت لازمی قرار دی گئی اور یہ طے پایا کہ جو
ادیب اس کی پابندی نہ کرے گا اسے تحریک سے رجعت پسند کہہ کر الگ کر دیا

جائے گا..... عوامی ادب کا نعرہ دے کر ادب کو خطابت اور صحافت کی سطح پر اُتارنے کی کوشش کی گئی..... ادب میں تہہ داری، رمزیت اور اشاریت کو ہیئت پرستی اور انحاطی ذہنیت کا نشان سمجھا گیا"۔(۲۱)

سخت گیر نظریاتی احتساب کے باعث ترقی پسندوں کا شیرازہ بکھرنے لگا۔ فنی شعور کے حامل ادیب و شاعر حاشیہ پر آ گئے۔ نیا ادب (بمبئی)، محاذ (بمبئی)، اور شاہراہ (دہلی)، جیسے ترقی پسندی کے ترجمان رسالوں میں وہ نوجوان لکھنے والے ہی جگہ پانے لگے جو پارٹی کے حکم نامے کے تحت فارمولا بند ادب کا انبار لگا رہے تھے، لیکن تھوڑے ہی عرصے میں موضوعاتی یکسانیت کے باعث اِن کا رنگ و روغن اترنے لگا اور تحریک جمود کی شکار ہو گئی۔ اس ضمن میں سردار جعفری نے لکھا ہے:

"آج ترقی پسند ادب پر ایک جمود سا طاری ہے، حالانکہ اب بھی نئی چیزیں لکھی جا رہی ہیں، نئے ادیب بھی آ رہے ہیں، پھر بھی پچھلے ادوار کے مقابلے میں آج جمود ہے اور ہمیں سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لینے کی ضرورت ہے"۔(۲۲)

دہلی کی چھٹی کل ہند کانفرنس (۱۹۵۳ء)، میں انتشار کو دُور کر کے اعتدال اور توازن کی راہ پر لانے کی تمام کوششوں کے باوجود تحریک تنظیمی بحران کا شکار ہو گئی اور خلیل الرحمن اعظمی کے بقول:

"آخر ۱۹۵۶ء، کی اُردو کانفرنس حیدر آباد میں عبدالعلیم اور سجاد ظہیر کو یہ اعلان کرنا پڑا کہ ترقی پسند تحریک اپنا تاریخی رول ادا کر چکی، اب اُردو کے ادیبوں کی ایسی تنظیم کی ضرورت ہے جس میں ہر نقطۂ خیال کے لکھنے والے ہوں"۔(۲۳)

تاہم ۱۹۷۰ء کے بعد جب ہندوستان کے سیاسی اور سماجی نظام میں کچھ ٹھہراؤ کے آثار پیدا ہوئے تو ترقی پسند فکر و نظر رکھنے والی اس پیڑھی نے جو آزادی کے بعد سامنے آئی تھی، تحریک میں نئی جان ڈالنے کی کوشش کی۔ اس کی سربراہی ڈاکٹر قمر رئیس نے کی۔ ادب اور عصری آگہی جیسے مسائل پر کئی کامیاب کانفرنسیں کی گئیں اور "عصری آگہی"، جیسے ترقی پسند مجلّے نے نئی پیڑھی کے ادیبوں کو قریب لانے اور تحریک کو ادب اور زندگی کے نئے تقاضوں سے ہم آہنگ بنانے کی کوشش کی۔

ترقی پسند ادبی تحریک کی تمام تر بے اعتدالیوں اور انتہا پسندی کے باوجود اس کے زیرِ اثر اُردو ادب میں ہونے والے اضافے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس تحریک سے وابستہ ادیبوں کی کوششوں سے ادب اور زندگی کا رشتہ مضبوط تر ہوا۔ ادب کو موضوعاتی وسعت حاصل ہوئی اور حقیقت پسندی کے رجحان نے فروغ پایا۔ تنقید، افسانہ اور

نظم جیسی اصناف کو کافی فروغ مِلا، ناولوں، ڈراموں، رپورتاژوں اور خاکوں کی بہترین مثالوں سے اُردو ادب کا دامن مالا مال ہُوا۔

## حوالہ جات


۱. احتشام حسین، سید: "تنقید اور عملی تنقید"، ذوق ادب و شعور، لکھنؤ، ۱۹۶۳ء، ص ۲۳۶
۲. عزیز احمد: "ترقی پسند ادب"، کاوانِ ادب ملتان، ۱۹۹۳ء، ص ۱۲۰
۳. افکار کراچی، مارچ ۱۹۷۴ء، مضمون مشمولہ، احمد علی: "ترقی پسند تحریک کا پسِ منظر"، ص ۴۰
۴. ایضاً، افکار مارچ ۱۹۷۴ء، ص ۴۳
۵. انور سدید، ڈاکٹر: اُردو ادب کی تحریکیں، انجمن ترقی اُردو، کراچی، ۱۹۸۸ء، ص ۴۶۸
۶. عسکری، محمد حسن: ستارہ اور بادبان، مکتبہ سات رنگ، کراچی، ۱۹۶۳ء ص ۶۳
۷. اختر حسین رائے پوری: ادب اور انقلاب، نیشنل بُک ہاؤس، بمبئی، ص ۲۵، ۲۴
۸. انور سدید، ڈاکٹر: اُردو ادب کی تحریکیں، انجمن ترقی اُردو، کراچی، ۱۹۸۸ء، ص ۴۶۹
۹. علامہ اقبال، کلیاتِ اقبال، فارسی، غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۷۳ء، ص ۵۱۷
۱۰. اختر حسین رائے پوری: "ادب اور انقلاب"، نیشنل بُک ہاؤس، بمبئی، ص ۸، ۷
۱۱. جعفری، علی سردار: ترقی پسند ادب، علی گڑھ، ۱۹۵۷ء، ص ۹
۱۲. خلیل الرحمن اعظمی: اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، علی گڑھ، ۲۰۰۲ء، ص ۳۳، ۳۲
۱۳. پریم چند: بحوالہ ایضاً، ص ۴۵
۱۴. سجاد ظہیر: روشنائی، مکتبہ دانیال، کراچی، ۱۹۷۶ء، ص ۱۳۴
۱۵. اختر انصاری: افادی ادب، حالی پبلیشنگ ہاؤس، دہلی، ص ۲۰
۱۶. خلیل الرحمن اعظمی، ڈاکٹر: اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، علی گڑھ، ۲۰۰۲ء، ص ۲۵۶
۱۷. ڈاکٹر عبدالعلیم: اُردو ادب کے رجحانات پر ایک نظر، آزاد کتاب گھر، دہلی، س ن، ص ۳۶
۱۸. گفتگو: بمبئی، ترقی پسند ادب نمبر۔ مرتبہ علی سردار، جعفری، بمبئی، ص ۹
۱۹. مجنوں گورکھپوری: ادب اور زندگی، لکھنؤ، ۱۹۵۵ء، ص ۱۶۱
۲۰. اختر انصاری: افادی ادب، آزاد کتاب گھر، دتی۔ طبع چہارم ۱۹۵۹ء، ص ۱۷
۲۱. خلیل الرحمن اعظمی: اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، علی گڑھ، ۲۰۰۲ء، ص ۳۳۸
۲۲. سردار جعفری: ترقی پسند ادب، علی گڑھ، ۱۹۵۷ء، ص ۲۷۶
۲۳. خلیل الرحمن اعظمی: اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، علی گڑھ، ۲۰۰۲ء، ص ۳۴۰